مولانا جوہر کی غزل
سیاسی جدوجہد کے آئینے میں

سلیم اللہ شاہ
لیکچرار گورنمنٹ کالج ،ٹاؤن شپ لاہور

MAULANA JAUHAR'S GHAZL
IN LIGHT OF POLITICAL STRUGGLE

Saleem Ullah Shah
Lecturer in Urdu, Govt College, Township, Lahore

Abstract

Muhammad Ali Jauhar is an important leader of our Freedom Movement. He has been instrumental in arousing political awareness among the Muslim. His dynamic and conspicuous political engagment eclipsed the poetic dimension of his personality. Nevertheless, he is rightly bracketed among the distinguished Urdu poets. Though the tradition of arousing political awareness is deep seated in the lyrical poetry, however Jauhar and his contemporaries especially Hasrat Mohani gave it a new orientation. Jauhar's lyrical flavour is drenched in politics, religion and nation, therefore his poetry reflects the agony of the Muslims. The concept of freedom is projected as the representative of the spirit of love in his poetry. Sacrifice---a dominant element of his personality reflects in the form of 'philosophy of martyerdom' in his poetry.

Keywords: طرابلس، بلقان، کانپور، جیل، غزل، شاعری تحریک آزادی، امام حسینؑ
مولانا محمد علی جوہر، واقعہ کربلا

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، تیغ و قلم دونوں کے سپاہی تھے۔ ان کے عزم میں پہاڑوں کی سی صلابت، جوش و جذبے میں سیل بے پناہ کی سی طغیانی اور سعی و عمل میں سچے کارکن کی سی مستعدی تھی۔ ہندستانی عوام اور بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی تاریخ محمد علی جوہر کی مرہون احسان رہے گی۔ ملت کا درد جوہر کے رگ و پے میں اترا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک پوری ملت اسلامیہ جسد واحد کی حیثیت رکھتی تھی چنانچہ دنیا کے کسی بھی حصے میں مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچتی تو اس کا درد، وہ اپنے دل میں محسوس کرتے اور اس کی درماندگی کے لیے اپنا تن من اور دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ وہ سچے معنوں میں عاشق ملت تھے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی قوم کے غم میں کھپا ڈالی۔ عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی دیوانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے۔ بلقان میں اتحادیوں پر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علی کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ترکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لیے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونیں پیش آ گیا۔ محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے۔ اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب، وہ مستوں کے مست تھے۔ مست الست!...۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہو گئی، خلافت اسلامیہ کی جنگ! آہ! وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم آخری بار لہر لیا۔ محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے۔ قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول، سنان و خنجر، زبان کھولی تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں، اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے۔ اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زبان بندی معطلی کی نذر، شاعری کے جوہر اسی زمانے میں چمکے، مظلوم کی زبان بن کر نالہ و فریاد کرتے ہیں۔''(۱)

مولانا جوہر کی شخصیت کا سیاسی پہلو اتنا نمایاں ہے کہ ان کی شاعری پس منظر میں چلی گئی ہے حالانکہ مولانا جوہر ایک بڑے سیاست داں ہی نہیں اردو کے ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے غزل کی صنف کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اگرچہ غزل کی رمز و ایمائیت میں سیاسی مضامین

کا بیان اردو شاعری کی روایت رہی ہے۔لیکن مولانا جوہر اور ان کے ہم عصر حسرت موہانی نے اسے نئی جدتوں سے روشناس کیا۔مولانا جوہر قدرت کی طرف سے ایک سیاست دان کا دماغ اور ایک شاعر کا دل لے کر آئے تھے۔چنانچہ ان کی شاعری عاشقی و حریت پسندی کا خوبصورت امتزاج بن گئی جس میں جذبہ عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔یہ عشق مذہب کے ایک سچے پیروکار، ملت کے مخلص غم خوار اور حریت و آزادی کے پرجوش علم بردار کا عشق ہے۔ان سارے جذبوں نے اس عشق کو بہت معتبر بنا دیا ہے۔بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ''انھوں نے اپنے قومی اور ملی احساسات تمام وکمال تغزل کے پیرایے میں بیان کیے اور اس میں Hightened Emotion یعنی جذبے و احساس کی اس شدت اور تندی کے ساتھ کہ اس کی دوسری نظیر کم سے کم اس دور کی غزل میں نہیں ملتی۔''(۲)

جیل کے مصائب ان کے یہاں غزل کے پیرایے میں درد ملت کی عاشقانہ کیفیت کا عنوان بن جاتے ہیں:

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا فریب — حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے(۳)

نہ اڑ جائیں کہیں قیدی قفس کے — ذرا پر باندھنا صیاد کس کے(۴)

محمد علی جوہر کا انداز بیان تغزل میں اس حد تک رچا بسا ہے کہ ان کے قومی و ملی جذبات کو عام عاشقانہ جذبات سے الگ دیکھنا دشوار ہے۔انھوں نے غزل کے روایتی موضوعات کو قومی و ملی احساسات سے اس طرح ہم کنار کیا ہے کہ غزل کی رمز و ایمائیت بھی قائم رہی اور اس صنف سخن کو ایک نئی جہت بھی مل گئی، چنانچہ ان کے یہاں پرجوش اور انقلابی نظریات کا اظہار بھی لطیف پیرائے میں بیان ہوا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری جوہر کے رنگ تغزل کے اچھوتے پن کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُنھوں نے غزل کو مردانگی اور انانیت کے ایسے لب و لہجے سے ہم کنار کیا جس کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کی غزلیں طرز احساس کے اس نئے پن سے عبارت ہیں جسے آج کی غزل کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری روایت سے بغاوت کی ایک خوبصورت مثال بن گئی''۔(۵)

درج ذیل غزل میں سیاسی جدوجہد کو مناجات کے رنگ میں کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے:

سینہ ہمارا فگار دیکھیے کب تک رہے　　چشم یہ خوننا بہ بار دیکھیے کب تک رہے
ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں　　پھر بھی ترا انتظار دیکھیے کب تک رہے
امت احمد کو ہے فضل کی تیرے امید　　فضل کی امیدوار دیکھیے کب تک رہے
یوں تو ہے ہر سو عیاں آمد فصل خزاں　　جورو جفا کی بہار دیکھیے کب تک رہے(۶)

جذبہ وجاںنثاری اور اخلاص جوہر کی شخصیت کے بنیادی اوصاف ہیں، انھوں نے جرأت و بے باکی کا راستہ اختیار کر کے اپنے عہد کی سیاست کو ایک نیا عصری شعور دیا، جس کے نتیجے میں ہندستان کا سیاسی افق نصف صدی سے زائد عرصے تک چھائے ہوئے سامراج سے مرعوبیت کے گردوغبار سے پاک ہوا۔ محمد علی کے صدق وصفا اور جذبہ جاںنثاری کا ذکر کرتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''جہاں تک کھرے پن، ایمانداری، سرفروشی، جاںنثاری اور اخلاص کا تعلق ہے، محمد علی کی شخصیت بے مثال تھی۔ ایسے فدائی کم اور بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی ذات ہندستانی سیاست اور مسلم قوم، دونوں کے لیے باعث فخر اور قابل رشک ہے۔ ان کے کارنامے ہماری تحریک آزادی میں اس قدر روشن اور تابناک ہیں کہ تعصب کی گرد بھی ان کی چمک کو دبا نہیں سکتی۔''(۷)

دین وملّت کے لیے جان قربان کرنا ان کی سب سے بڑی تمنا تھی اور اسی تمنا کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک عجیب سرشاری اور وارفتگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے اشعار پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ دین وملّت کے لیے انہیں اپنی جان قربان ہونے کا پورا یقین تھا:

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر　　　یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے(۸)

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ　　　اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ(۹)

شہادت امام حسینؓ اور واقعہ کربلا کو وسیع تر قومی وملی معنوں میں پہلی بار استعمال کرنے کا امتیاز مولانا جوہر کو حاصل ہے۔ انھوں نے شہادتِ حسینؓ کا ایک حیات آفریں تصور پیش کرتے ہوئے اسے جاں فروشی اور حریت پسندی کے ایک استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے اسلام کے فلسفۂ شہادت اور امام حسینؓ کی تعلیمات کو اس شعر میں اس بلیغ انداز میں پیش کیا ہے کہ واقعہ کربلا کی تفہیم وتذکیر میں یہ شعر ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے:

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے　　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد(۱۰)

مولانا جوہر نے حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو قوم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی زندگی میں اپنی ذات کے لیے نہایت کم حصہ تھا، جو پورے طور پر قومی جدوجہد میں بسر ہوئی۔ ملت کا سوز ان کے یہاں سوزِ جاں بن گیا۔ یہی سوزِ دروں غزل کے پیرائے میں اس دل گداز انداز میں بیان ہوا ہے کہ پڑھنے والے کا دل پسیج جاتا ہے۔ درج ذیل اشعار جہاں ایک پیش گوئی کا درجہ رکھتے ہیں، وہاں ایک عاشق ملت کی خودسپردگی کی تمثیل بن گئے ہیں:

سوزِ دروں سے جل بجھو، لیکن دھواں نہ ہو　　　ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا　　　جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو(۱۱)

مولانا جوہر کی شاعری میں عشق کا جذبہ ایک نئی معنویت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ عشق کی یہ کیفیت سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی ہے اور ہر آن ایک نئی سرشاری سے ہم کنار ہوتی ہے۔

عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

''بلاشبہ ان کی شاعری چاشنی عشق سے بیگانہ نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ عشق کی کسک ان کے ایک ایک مصرع میں موجود ہے البتہ ان کا معشوق نہ ایران کا 'سبز خط' ہے، نہ ہندستان کا 'بت سیمیں بدن'۔ ان کا معشوق مردہ نہیں، زندہ ہے، فانی نہیں باقی ہے، سفاک وستم گر نہیں، رحمٰن ورحیم ہے۔ ان کا محبوب وہ ہے جو ہر مسلم یا ہر سلیم الفطرت کا ہوتا ہے۔''(۱۲)

مولانا کی اس غزل میں ان کے عشق کے والہانہ پن اور وارفتگی کے جذبے کا بڑے دل گداز انداز میں اظہار ہوا ہے۔ غزل کا ایک ایک شعر سرشاری کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے:

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا   سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے   یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف   کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
کیوں ایسے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے   اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لیے ہے(۱۳)

۱۹۲۲ء میں جسم پابند سلاسل ہے لیکن دل ودماغ میں جذبات کا ایک تلاطم ہے کہ سنبھلنے نہیں پاتا، بالآخر یہ جذبات دعا ومناجات کی صورت میں اپنے رب کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ ایک دن قید خانے کے دروازے سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود یہ قیدی گوشہ نشیں کہہ اٹھتا ہے:

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی   سن لی خدا نے قیدئ گوشہ نشین کی(۱۴)

مولانا جوہر کی شخصیت اپنے اندر پورے عہد کا اضطراب سموئے ہوئے تھی۔ یہ اضطراب اپنے ملک کی غلامی کا بھی تھا اور عالم اسلام کی زبوں حالی کا بھی۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین: ''ایک بیدار ہونے والے ملک اور خواب گراں سے جاگتے والی ملت کی ساری بے تابی، سارا وفور شوق، ساری سرگرمیاں، ساری خود فراموشی، ایک پیکر خاکی میں جلوہ گر تھی۔''(۱۵) اس ملی وقومی اضطراب کے نتیجے

میں مولانا کی شخصیت سراپا جدوجہد بن گئی تھی۔ یہ جدوجہد چونکہ غاصب حکمرانوں اور استعماری نظام کے خلاف تھی، اس لیے مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کے خوبصورت سال جیل میں گزرے۔ انھوں نے اپنی ذاتی اور خانگی خوشیوں کو قوم کے لیے قربان کر دیا۔ جیل میں اپنی قید کی زندگی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والا آبدیدہ ہو جاتا ہے:

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے   تھے نہ ہم اس کے آستانے کے
ایک ایک کر کے سب کے سب تنکے   ہوئے برباد آشیانے کے
کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا   ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے
دیکھیے اب یہ گردش تقدیر   کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال   ہم ہیں باشندے جیل خانے کے(۱۶)

قید اور وہ بھی قید تنہائی، بیجاپور کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ عرفان وآگہی کے کیا کیا مراحل طے ہوئے، سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا، لذت آشنائی کے کیسے کیسے در کھلے اور التفات وعنایات کی کیسی کیسی سعادتیں نصیب ہوئیں کہ عشق ومستی کے جذبات کا اظہار کیے بغیر چارہ نہ رہا:

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں   اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے!!   ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں!
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے ہیں وعدے   ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں!
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت   اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں!   بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں(۱۷)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جوہر کی شاعری پر بڑا ابلیغ تبصرہ کیا ہے:

> ''ان کی غزل کی زمین جذبۂ حریت کے خون کے چھینٹوں سے سرخ ہے۔ اس میں شہادت کا مژدہ بھی ہے اور اس حیات جاوداں کی بشارت بھی۔ جو کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے نقد جاں کو ہارنے اور سب کچھ ٹھکانے لگا دینے سے حاصل ہوتی ہے۔''(۱۸)

مولانا جوہر کی شاعری ان کی شخصی کیفیتوں کی آئینہ دار ہے۔توحید اور رسالت پر کامل ایمان کی وجہ سے وہ دنیاوی آلام سے بے نیاز اور لذت آشنائی سے سرشار ہوگئے تھے۔سرشاری کی اس کیفیت نے ان کی غزل میں والہانہ پن اور جوش وخروش پیدا کردیا ہے۔وہ بلند لہجے میں آزادی مخالف اور استحصالی قوتوں کو دعوت مبارزت دیتے ہیں اور راہِ حق میں دی جانے والی قربانیوں پر صبر وقرار ہی نہیں فخر وانبساط کا بھی اظہار کرتے ہیں۔وہ شہادت حسینؓ کو ایک ایسے روشن استعارے کے طور پر پیش کرتے ہیں جس سے ان کی پوری شاعری کے الفاظ جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں، جہاں جہد وعمل، ایثار وقربانی اور حریت وآزادی کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔انھوں نے اردو غزل کو قومی مقاصد کی بجاآوری کے لیے اس فنکارانہ انداز میں استعمال کیا ہے کہ تغزل ہی قائم نہیں رہا بلکہ غزل کی شان بھی بڑھ گئی ہے۔وہ حقیقی طور پر ایک بڑے رہنما ہی نہیں اردو کے ایک اہم شاعر بھی تھے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) مولانا عبدالماجد دریابادی: آزادیٔ وطن اور جوہر کی شاعری، مشمولہ: صریر خامہ (قومی شاعری نمبر)، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵

(۲) گوپی چند نارنگ: ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۴۶۵

(۳) مولانا محمد علی جوہر: دیوان جوہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۳۹ (۴) ایضاً، ص ۸۷

(۵) فرمان فتح پوری: ماہنامہ نگار پاکستان، کراچی ''مولانا محمد علی جوہر نمبر'' نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء، ص ۷۸

(۶) دیوان جوہر، ص ۱۴۲

(۷) رشید حسن خاں: تلاش وتعبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۸۸ء، ۳۰

(۸) دیوان جوہر، ص ۷۷ (۹) ایضاً، ص ۱۳۸ (۱۰) ایضاً، ص ۱۲۵ (۱۱) ایضاً، ص ۱۳۹

(۱۲) بحوالہ، رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی، کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۷

(۱۳) دیوان جوہر، ص ۱۴۱ (۱۴) ایضاً، ص ۵۱

(۱۵) رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی جوہرؒ (نگاہ اولین از ڈاکٹر ذاکر حسین)، ص ۷

(۱۶) دیوان جوہر، ص ۴۳ (۱۷) ایضاً، ص ۱۳۱

(۱۸) ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، ص ۴۷۷، ۴۷۸